ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں!

پروفیسر محمد سلیم

آج ۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء ہے۔ میری کلاس آج دس بجے تھی۔ میں تھوڑا سا لیٹ تھا۔ جلدی جلدی گاڑی سٹارٹ کی۔ صبح یاد نہیں پڑتا لیکن گمان غالب ہے کہ ذوالکفل بخاری المعروف شاہ جی مجھ سے پہلے ہی اپنی گاڑی میں جا چکے تھے۔ گرمی کی چھٹیوں سے پہلے اُنھوں نے سرخ رنگ کی ۱۹۹۸ء ماڈل کرولا لی تھی۔ اچھی گاڑی تھی۔ مجھے یاد ہے جب پہلی دفعہ میں اور سجاد صاحب شاہ جی کے ساتھ حرم گئے تو ہم دونوں نے شاہ جی سے کہا کہ ابھی آپ کی ڈرائیونگ اِتنی اچھی نہیں لہٰذا ہجوم میں اور بڑی سڑکوں پر آپ گاڑی نہیں چلائیں گے۔ اِس کے بعد متعدد بار جدہ یا طائف جانا ہوا۔ کبھی میں جب کہ زیادہ تر سجاد صاحب شاہ جی کے ساتھ گاڑی چلا کر لے جاتے۔ شاید ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ہم نے شاہ جی کو اکیلا جدہ بھیجا ہو۔ ہاں البتہ یونیورسٹی تک کئی دفعہ یا تو وہ اکیلے جاتے یا ہم میں سے کوئی ایک ساتھ ہوتا۔

آج اُن کے اکیلے جانے کی وجہ یہ بھی تھی کہ بعض پروفیسر حضرات کی کلاسز میں طلبہ تھے جب کہ زیادہ تر بچے حج کے رش کی وجہ سے آخری ہفتے غائب ہوجاتے ہیں۔ میں نے اگلے دن کہا تھا کہ میرے طلبہ کل آرہے ہیں۔ المختصر میں یونیورسٹی چلا گیا۔ میرے طلبہ کا اصرار تھا کہ ۱ تا ۳ بجے والی کلاس کو شارٹ کر کے ۱۲ سے ۱:۳۰ تک ختم کردوں تاکہ دور دراز کے طلبہ اپنے گھروں کو واپس جاسکیں۔ بظاہر یہ ان کا چھٹیوں سے پہلے آخری دن تھا، حالانکہ ابھی ہفتہ کے ختم ہونے میں تین دن باقی تھے۔ میں نے بریک دیے بغیر کلاس جاری رکھی۔ ہاں، اِس دوران میں کافی کا ایک کپ لیے سٹاف روم تک آیا۔ میں نے دیکھا کہ شاہ جی وہیں دوسرے پروفیسر حضرات کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میں چونکہ جلدی میں تھا اور وہ بھی مصروف تھے، چنانچہ ہمارا صرف مسکراہٹوں کا ہی تبادلہ ہوا اور میں کافی لے کر واپس اپنی کلاس میں چلا گیا۔ البتہ پروفیسر نثار احمد نے کہا کہ ہم بیٹھے ہیں۔ جلدی کلاس ختم کر کے آجانا، تھوڑا گپ شپ ہوگی۔ میں نے ۱:۳۰ کی بجائے ۱:۲۰ پہ کلاس ختم کی۔ سٹاف روم آیا تو سارے لوگ جا چکے تھے۔ جلدی جلدی بچوں کے ساتھ ہی نمازِ ظہر ادا کی اور گھر واپسی کا راستہ لیا۔ یونیورسٹی سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہم یوٹرن لے کر عزیزیہ کی سڑک پر آتے ہیں۔ یہ وہ ڈبل روڈ ہے کہ اگر اِس پر سیدھے جائیں تو عرفات پہنچ جائیں۔ چنانچہ تھوڑا سا متوازی چل کے یوٹرن سے واپس ہوتے ہیں۔ میں اسی سڑک پر آرہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ آج مجھے کوئی کال نہیں آئی۔ میں نے اپنا موبائل نکالا تو وہ رات کا ہی بند پڑا تھا۔ مصروفیت میں مجھے اِسے کھولنا یاد ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے موبائل آن کیا۔ جونہی میں دائیں طرف مڑا، سامنے میری نظر ایک ہجوم پر پڑی جہاں بہت ساری پولیس کی گاڑیاں اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ تھوڑا قریب گیا تو ایسا لگا جیسے کوئی حادثہ ہوا ہے۔ قریب میں کھڑے ایک پاکستانی سے پوچھنے پر

معلوم ہوا کہ کسی پاکستانی کا پولیس کی گاڑی کے ساتھ شدید حادثہ ہوا ہے۔ میں صرف یہ سوچ کر گاڑی سے نیچے اترا کہ شاید میں اپنے پاکستانی بھائی کی کوئی مدد کرسکوں، ہسپتال جانا ہو یا خون وغیرہ دینا ہو۔ قریب گیا تو پولیس کی جیپ کو دفاعِ مدنی (شہری دفاع) کا لفٹر اُٹھا رہا تھا۔ اِس سے پہلے کہ میں کسی سے کچھ پوچھتا، میری نظر دوسری گاڑی پر پڑی۔ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ گاڑی بری طرح تباہ ہوچکی تھی۔ پولیس کی گاڑی نے کراس کرتی ہوئی اِس گاڑی کو ڈرائیور والی سائیڈ سے ٹکر ماری تھی اور تقریباً ۴۰ میٹر تک گھسیٹتے ہوئے لے گئی تھی۔ مجھے ایک پل کو اپنا دماغ سُن ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ گاڑی کسی اور کی نہیں تھی بلکہ ہمارے انتہائی قریبی اور پیارے دوست شاہ جی کی گاڑی تھی۔ گاڑی کو دیکھ کر مجھ پر عجیب خوف کی کیفیت طاری ہوگئی۔ کچھ ہمت کرکے میں نے پاس کھڑے پولیس آفیسر کو بتایا کہ یہ گاڑی میرے دوست کی ہے۔ اُس نے مجھ سے نام پوچھا۔ میرے نام بتانے پر اُس نے شاہ جی کا اقامہ دکھایا اور پوچھا کہ یہی تمھارا دوست ہے۔ میں نے ہنکارا بھرتے ہوئے جلدی سے پوچھا اُس کی حالت کیسی ہے؟ اُسے کسی ہسپتال میں لے کر گئے ہیں؟ میرے چہرے پر تشویش کو شاید وہ سمجھ گیا تھا۔ دھیمے سے جواب دیا کہ تم اُس کے لیے دعا کرو۔ اللہ اُس پر اپنی رحمت کرے۔ اُس نے جو کہنا تھا، کہہ چکا تھا۔ میری عربی بھی اِتنی کمزور نہیں کہ میں سمجھ نہ سکتا۔ لیکن میں نے اُس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ میں لاشعوری طور پر خودفریبی کا شکار ہورہا تھا۔ میں ایسی خبر پر یقین کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنے شاہ جی کو ہر صورت میں زندہ دیکھنا چاہتا تھا، چاہے وہ زخمی ہی کیوں نہ ہو۔

میری حالت عجیب ہورہی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں اپنے انگلش لینگویج سنٹر کے ڈائریکٹر کو فون کروں۔ حادثے کا بتاؤں تاکہ وہ بھی ہسپتال فون وغیرہ کریں، کہ شاہ جی کو بہتر کیئر مل سکے۔ میں نے اُن کا نمبر ڈائل کیا۔ میرے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ جب میں نے اُنھیں حادثے کا بتایا تو اُنھوں نے پوچھا تم کہاں ہو۔ میں نے مزید کچھ بتائے بغیر فون پولیس آفیسر کو دے دیا۔ وہ مجھ سے دو قدم دور کو ہوگیا۔ لیکن میں اب جان چکا تھا۔ اُس نے ہمارے ڈائریکٹر کو بتایا کہ وہ موقع پر ہی فوت ہوگئے تھے۔ اِس کے باوجود میں نے موبائل فون واپس لیتے ہوئے آفیسر سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ احتمال ہے کہ وہ بچ جائیں۔ لیکن اب شاید مجھے اُس کی بات کا یقین نہیں آرہا تھا۔ اُس نے تو میری حالت دیکھ کر صرف بات بنائی تھی۔ میں بار بار اللہ اکبر، اللہ اکبر کہہ رہا تھا اور گم سم کھڑا تھا۔ یہ کیا ہوگیا! ایک ایسی خبر جس نے مجھے بالکل confuse کردیا تھا۔ مجھے کچھ ہوش نہیں آرہی تھی۔ ایک ایسا صدمہ جس سے میرے ہاتھ کانپنے شروع ہوگئے۔ میرا منہ سوکھ رہا تھا۔ پھر اچانک ایک خیال اور آیا کہ شاہ جی اکیلے نہیں آیا کرتے تھے بلکہ اُن کے ساتھ سجاد بھی ہوتا تھا۔ اِس خیال سے حالت کچھ اور بھی عجیب ہوگئی۔ یہ دونوں میرے عزیز ترین دوست ہیں۔ اب مجھ میں اِتنی ہمت نہیں تھی کہ میں نمبر ڈائل کرسکتا۔ speed dial کا بٹن دبایا۔ نمبر بند آرہا تھا۔ فوراً ہی اپنی اہلیہ کا نمبر جو دوسرے speed dial پہ تھا، دبایا۔ یاد رہے کہ میں اور سجاد صاحب ایک لمبے عرصہ سے ساتھ رہ رہے ہیں۔ میں نے اُن کی بیگم سے صرف اِتنا پوچھا کہ سجاد بھائی کہاں ہیں؟ اُس نے کہا بتایا کہ وہ تو آج یونیورسٹی نہیں گیا کیونکہ اُس کی کلاس نہیں تھی۔ میں نے موبائل سجاد صاحب کو دینے کا کہا۔ میں کم از کم اُس کی آواز سننا چاہتا تھا۔ میرے پاس ایک بُری خبر بھی تھی جو میں نے ایک ہی سانس میں بتادی اور کہا کہ میں آرہا ہوں، سڑک پر میرا انتظار کرو تاکہ ہم ہسپتال جاسکیں۔ واپس گاڑی میں بیٹھا۔ اُس وقت شہری دفاع کے اہلکار شاہ جی کی بدقسمت گاڑی کو لفٹر سے اُٹھا رہے تھے۔ میں کچھ

وقت گاڑی میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ میں نے تو اناللہ تک نہیں پڑھا تھا، اور نہ ہی میرے آنسو نکلے تھے۔ صرف ایک غم اور افراتفری کی کیفیت تھی۔ وہاں سے ہمارے گھر تک تقریباً دس منٹ لگتے ہیں۔

اب میں گاڑی میں اکیلا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ماضی کی فلم چلنی شروع ہوگئی۔ شاہ جی اب ماضی تھا، ایک قصۂ پارینہ بن چکا تھا۔ مجھے اُس کی ایک ایک ادا یاد آرہی تھی۔ میرے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ میری آنکھیں بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ اب میں ذہنی طور پر تسلیم کررہا تھا کہ میرا دوست مجھ سے بچھڑ چکا ہے۔ اُسے اللہ نے اپنے پاس واپس بلالیا ہے۔ اِنہی سوچوں میں گم تھا کہ عزیزیہ میں گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ سجاد صاحب انتظار اور تشویش کے عالم میں مضطرب کھڑے تھے۔ وہ بھی حساس آدمی ہیں۔ اور بخاری اُن کا بھی اُتنا ہی عزیز تھا جتنا کہ میرا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی کہنے لگے یہ کیا ہوگیا سلیم۔ میں نے صرف سر ہلایا۔ پھر پوچھا یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔ مجھ میں جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ میں نے اشارے سے خاموشی اختیار کرنے کو کہا۔ ہمارے گھر سے تقریباً دس منٹ شاہ فیصل ہسپتال تک لگتے ہیں۔ ہم جلدی جلدی ہسپتال پہنچے۔ ایمرجنسی میں بغیر اجازت ہی داخل ہوگئے۔ نرس نے بتایا کہ یہاں ذوالکفل نام کا کوئی مریض نہیں ہے۔ CPR روم میں پتہ کریں۔ سیکورٹی گارڈ سے دریافت کیا۔ اُس نے پہلے تو اندر جانے سے منع کردیا۔ پھر ہمارے اصرار پر جانے دیا۔ داخل ہوتے ہی دوسرے بیڈ پر ہمارے دوست کا جسدِ خاکی پڑا تھا۔ اوپر سفید چادر۔ شاید ہی میں زندگی میں یہ لمحہ بھول سکوں۔ شاہ جی سویا ہوا تھا، ابدی نیند سویا ہوا تھا۔ چہرے پر ایک دو خراشوں کے علاوہ کوئی گہرا زخم نہیں تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ سر کی پچھلی جانب چوٹ آئی ہے کیونکہ مسلسل خون رِس رہا تھا۔ گردن بائیں طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ شاید اِسی طرف سے گاڑی آرہی تھی جس کو دیکھتے دیکھتے شاہ جی کو دوبارہ مڑنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ ماتھے پر البتہ گاڑی کے سٹیرنگ کا نشان پڑا تھا۔ ہم دونوں شاہ جی کے سرہانے کھڑے ایسے بچوں کی طرح رورہے تھے جن کی ماں اُنھیں اچانک چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ شاہ جی کے چہرے پر ہلکی سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ شاید ہم اداس تھے اِس لیے ہمیں ایسا لگا ہو۔ ایک گھنٹہ پہلے میں اُن کو سٹاف روم میں مسکراتے چھوڑ کر گیا تھا۔ اب کی دنیا بالکل بدل چکی تھی۔ ہم کبھی شاہ جی کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے تو کبھی ڈاڑھی پر۔ خوب جی بھر کے رونے کے بعد دوستوں کو فون کیا۔ جدہ میں اُن کے کزن ہیں حُسنی مبارک، اُن کو فون کیا۔ اب ہم نارمل ہونے کی کوشش کررہے تھے۔ ہمیں احساس تھا کہ آگے کی ساری ذمہ داریاں اب ہم پر ہیں، سب کچھ ہم نے ہی کرنا ہے۔ حُسنی مبارک جدہ سے نکل آئے تھے۔ یونیورسٹی کے دوست تیزی سے جمع ہورہے تھے۔ اب ہمارے لیے اگلا مسئلہ یہ تھا کہ شاہ جی کی اہلیہ کو کیسے بتایا جائے، کس وقت بتایا جائے۔ حسنی مبارک نے کہا کہ اُن کو میرے آنے تک نہ بتایا جائے۔ وہ آکر خود صورتِ حال کو سنبھال لیں گے۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ تھوڑی دیر میں شاہ جی کو کولڈ سٹور میں منتقل کرنا ہوگا کیونکہ یہاں وہ زیادہ دیر تک نہیں رکھ سکتے۔ اور بہتر یہی ہے کہ شاہ جی کی اہلیہ کو یہیں بلاکر جسدِ خاکی دکھادیں۔ میں نے سجاد صاحب سے پوچھا۔ اُن کو بھی یہ کام بہت مشکل لگا۔ بہرحال میں نرس سے دس منٹ لے کر ہسپتال سے نکل آیا۔ سجاد صاحب پولیس سٹیشن سے گھر واپس آرہے تھے۔ میں گھر کے نیچے پہنچا تو سجاد صاحب میرے انتظار میں تھے۔ میں نے اُنھیں کہا کہ جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔ ہم کب تک اِس بات کو چھپا کر رکھ سکتے ہیں۔ آخرکار یہ حقیقت پتہ تو چلے گی۔ ہماری ہمت نہیں ہورہی تھی۔ ہم نے اپنی خواتین کو شاہ جی کے گھر جانے کا بہت پہلے سے کہہ دیا تھا۔ جونہی ہم اوپر آئے تو ہماری خواتین نے بتایا کہ شاہ جی اہلیہ کو پاکستان سے شاہ جی کی وفات کی خبر آچکی ہے۔ اب

میں نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کی۔ اپنی اہلیہ سے کہا کہ دونوں خواتین تیار ہو کر نیچے گاڑی میں آ جائیں۔ بچوں کو میں نہیں لے جانا چاہتا تھا، لیکن کس میں یہ ہمت تھی کہ اُنھیں وہیں روکتا۔ میں نے گاڑی سٹارٹ کی اور صرف دو تین باتیں کیں۔ اِس سے پہلے میری دعا سلام کے علاوہ کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے صرف اِتنا کہا کہ میں آپ لوگوں کو ہسپتال لے جانا چاہتا ہوں۔ المختصر ہم ہسپتال پہنچ گئے۔ تقریباً تمام پروفیسر صاحبان پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں حسنی مبارک صاحب جدہ سے چند دوسرے احباب کے ساتھ پہنچ گئے۔ میں شاہ جی کی اہلیہ اور اپنی بیوی کو واپس گھر چھوڑ گیا۔ اُس وقت تک بخاری صاحب کے بھائی کفیل شاہ صاحب سے تدفین مکہ مکرمہ میں ہی کرنے کی اجازت مل چکی تھی۔ اِسی دوران سجاد صاحب پولیس سٹیشن چلے گئے اور حادثہ کی ابتدائی رپورٹ لے آئے۔ مغرب کی نماز تمام حضرات نے ہسپتال کی مسجد ہی میں پڑھی۔ اب تدفین کی باتیں شروع ہوئیں۔ مجھے غم تھوڑا بھول سا گیا اور اگلی مصروفیات شروع ہو گئیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ جنازہ صبح کی نماز کے ساتھ ہو جائے۔ یہ بظاہر اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور نظر آ رہا تھا۔ دوسری خواہش تھی کہ بخاری صاحب کو جنت المعلیٰ نصیب ہو۔ ہم ہسپتال میں کھڑے اِنہی موضوعات پر باتیں کر رہے تھے کہ مولانا سیف الرحمٰن صاحب مدرس مدرسہ صولتیہ کے فرزند عبدالمالک صاحب جن سے شاہ جی کے خاندان کے دیرینہ تعلقات ہیں، پہنچ گئے۔ مغرب کے بعد ایک ٹیم جو حسنی مبارک اور عبدالمالک صاحب پر مبنی تھی، کو سفارت خانے کا کام سونپا گیا جب کہ میں اور سجاد صاحب واپس گھر چلے گئے کیونکہ دوستوں کی ایک بڑی تعداد گھر پہنچ چکی تھی۔ جدہ سے ایک معروف صحافی رؤف طاہر، مولانا اکرم صاحب، مدینہ سے شاہ جی کے چچا سید غلام مصطفیٰ شاہ صاحب، مدرسہ صولتیہ سے ڈاکٹر سعید صاحب، عشا تک یہ سارے حضرات شاہ جی کے گھر پہنچ چکے تھے۔ ہمارا گھر کافی بڑا ہے۔ ایک فلیٹ صرف خواتین کے لیے مختص کر دیا گیا جب کہ دوسرا حصہ جو کہ چار کمروں کا تھا، مرد حضرات کے لیے مختص ہوا۔ مجھے اب یہ فکر کہ جنت المعلیٰ کا اجازت نامہ کیسے حاصل کیا جائے۔ بظاہر یہ ایک مشکل امر ہوتا ہے۔ ہمارے ایک دیرینہ دوست ہیں جو ہمارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں، ڈاکٹر عبداللہ مطرفی۔ یہ قبیلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے مکہ کے قرب و جوار میں آباد ہے۔ کھلے دل کے لوگ ہیں۔ مختصر سے وقت میں یہ مطرفی صاحب میرے بہت اچھے دوست بن گئے تھے۔ وہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ جنت المعلیٰ میں اجازت نامے کا معاملہ اُن کے سامنے رکھا۔ شاید وہ اِسی انتظار میں تھے کہ شاہ جی کے لیے کچھ کر سکیں۔ وہ شخص رات بھر نہیں سویا۔ ہر گھنٹے آدھے گھنٹے میں میرے ساتھ فون پر رابطہ رکھا، بلکہ اِتنا خیال پردیس میں شاید اپنے بھی نہ کر پائیں۔ اللہ اُسے جزائے خیر عطا فرمائے۔ رات کے ۹ بج چکے تھے۔ عبدالمالک صاحب کے پاس سب سے مشکل کام ہے جس کے لیے عام طور پر کم از کم چوبیس گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔ پولیس اسٹیشن سے حادثہ کی ابتدائی رپورٹ لے کر اُس کو پاکستانی سفارت خانہ جدہ سے تصدیق کروانے کے ساتھ دو تین اور کاغذات بنوانے تھے۔ ہمارا بخاری شہید تھا۔ بس اللہ ہی اُس کے لیے ہر کام کو اِتنا آسان بناتا چلا گیا۔ سفارت خانے والا کام صرف دو گھنٹے ہی میں مکمل ہو گیا۔ بارہ بجے رات کے لگ بھگ میں نے یونیورسٹی کے تمام دوستوں کو اطلاع دی کہ اِن شاء اللہ نمازِ فجر کے ساتھ بخاری کا جنازہ حرم میں پڑھا جائے گا۔ دوسری طرف عبداللہ مطرفی رابطے میں تھے۔ اُنھوں نے جنت المعلیٰ میں تدفین کے سارے انتظامات مکمل کروا لیے تھے۔ رات ڈھائی بجے کے لگ بھگ ہم اپنے دوست کے جسدِ خاکی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے مسجدِ رُسیفہ جا رہے تھے۔ اب کچھ اور کیفیت تھی۔ بخاری ہم سے جدا ہو چکا تھا، لیکن ایک احساس تھا اُس کی موجودگی کا، اگرچہ زندہ نہ

سہی۔ ملک فیصل ہسپتال سے مسجد تک تقریباً بیس منٹ لگے۔ یہاں جنازے کو غسل مساجد سے ملحقہ مغلسوں میں دیا جاتا ہے۔ عموماً یہاں دو سے تین آدمیوں کو ساتھ جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن اب کی بار تو چھے سات لوگ اندر موجود تھے۔ بخاری کے دوست اُسے اُس کے خالقِ حقیقی کے سامنے پیش کرنے کے لیے یوں تیار کر رہے تھے جیسے دولھے کو اُس کے دوست تیار کرتے ہیں۔ خوشبو لگائی جارہی تھی۔ کفن پہنایا جارہا تھا۔ ہمارا بخاری مسکرا رہا تھا۔ چہرہ پرسکون تھا۔ بالکل اِس طرح جیسے کوئی آدمی کوئی بہت بڑی ذمہ داری پوری کرنے کے بعد مطمئن نظر آتا ہے۔ اُس طمانیت میں خوشی بھی ہوتی ہے اور اعتماد بھی۔ ہم نے حقیقتاً یہی کیفیت دیکھی۔ کفن پہنانے کے بعد جب چہرہ دوبارہ کھولا گیا تو سب دوستوں نے بخاری کا ماتھا چوما۔ میں نے تو ڈاڑھی بھی چوم لی۔ ایک بار پھر آنکھیں برس پڑیں۔ بخاری بہت جلدی چلا گیا تھا۔ اُس کی رفاقت ہمیں زیادہ دنوں کے لیے نصیب نہ ہوسکی۔ وہ سب کو چھوڑ گیا۔ آج دوپہر کے وقت تو ہم ساتھ تھے، پھر یہ کیا ہوا؟

اللہ کی شان، حرم میں سب سے پہلے داخل ہونے والا جنازہ بخاری کا تھا حالانکہ ہم سوچ رہے تھے کہ ہم لیٹ ہوگئے ہیں۔ خانہ کعبہ کے سامنے رکنِ یمانی اور حجرِ اسود سے متصل بخاری دو نئی سفید چادروں میں لپٹا ہوا رکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شاید موت بھی اُس کی قسمت پر رشک کر رہی ہے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے بارہ (۱۲) مزید جنازے آئے۔ لیکن سب سے پہلے چونکہ بخاری کا جنازہ تھا سو امام صاحب نے بخاری کے بالکل پاس کھڑے ہوکر جنازہ پڑھایا۔ بخاری کے چاہنے والوں کی ایک بڑی تعداد جنازے کو کندھا دینے کے لیے بے تاب تھی۔ عبداللہ مطرفی نے میرے ساتھ کھڑے ہوکر جنازہ پڑھا۔ ہم جنازہ لے کر دوبارہ گاڑی میں بیٹھے۔ جنت المعلی کے گیٹ سے گاڑی تھوڑی دور روکی۔ میں اور عبداللہ مطرفی گیٹ پر گئے اور بلدیہ کے مدیر کا حوالہ دیا کہ رات کو اُس سے اجازت لے لی گئی تھی۔ ہمارا بخاری اُس قبرستان میں جارہا تھا جس کو پانے کے لیے لوگ زندگی بھر دعائیں مانگتے ہیں۔ جی ہاں، بخاری جنت المعلی میں جارہا تھا۔ قبر نمبر ۱۷۸/۵ تیار تھی۔ بھیگی پلکوں اور کانپتے ہونٹوں کے ساتھ کلمۂ شہادت کا وِرد ہورہا تھا۔ صبح کی روشنی ابھی پھیلی نہیں تھی۔ موسم میں ہلکی سی خنکی تھی۔ سامنے کی جانب کعبۃ اللہ تھا۔ تھوڑا سا ہٹ کے ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا روضۂ مبارک ہے، اور دوسرے کئی جید صحابہ بھی اِس قبرستان میں آرام فرما رہے ہیں۔ واہ بخاری تیری قسمت.....

اِس شوق میں کہ میں اپنے دوست کو خود رخصت کروں، میں کسی کا انتظار کیے بغیر حسنی مبارک صاحب کے ساتھ قبر میں اُترا۔ لیکن عبدالمالک صاحب کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے دوبارہ اوپر آگیا۔ یوں عبدالمالک اور حسنی مبارک نے بخاری کو آخری کاندھا دیا اور قبر میں اتارا۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہورہا تھا۔ جونہی عبدالمالک صاحب اوپر آئے، میں ایک دم سے دوبارہ قبر میں اتر گیا۔ میں اپنے بخاری کو الوداعی سلام کرنا چاہتا تھا۔ ایسے لمحوں میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے۔ سو میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ مجھے آج بھی میرا دوست وہاں نظر آرہا ہے۔ میں اِن آخری لمحوں کو کبھی نہیں بھولنا چاہتا۔

صبح کافی روشن ہوگئی تھی۔ دور کہیں پہاڑوں پر سورج کی کرنیں پڑ چکی تھیں۔ ہم سب سر جھکائے قبرستان سے واپس آرہے تھے۔ جاتے ہوئے بخاری ہمارے ساتھ تھا۔ اب ہم اکیلے تھے۔ مجھے بخاری جیسا دوست اور بھائی زندگی میں کبھی ملے گا؟